قضائے قاضی کا ظاہری و باطنی نفاذ

سوال: شرح وقایہ ج ۳ باب المرافعہ اور ہدایہ ج ۳ باب کتاب القاضی الی القاضی میں یہ عبارت درج ہے:

وکل شیٔ قضیٰ بہ القاضی فی الظاہر بتحریمہ فھو فی الباطن کذالک عند ابی حنیفۃ وکذا اذا قضی باحلال۔ لیکن قرآن میں ہے: وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ نیز صحیح بخاری میں ہے: فلعل بعضکم ان یکون ابلغ من بعض فاحسب انہ صدق ... فانما قطعۃ من النار۔ اس طرح قرآن و حدیث سے اس قول کی تغلیط ثابت ہو رہی ہے اور یہ قول بالبداہت کتاب و سنت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ حضرت مولانا تھانوی نے بوادر النوادر میں بھی اس قول کی تائید کی ہے مگر اطمینان نہیں ہوا۔ اس قول کی صحیح توجیہ اگر کوئی ہے تو رقم فرما دیں۔

جواب: آپ نے امام ابوحنیفہؒ کا جو قول نقل کیا ہے بلاشبہ اس کا مفہوم متعین کرنے میں بعض اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعی اور بعض دوسرے فقہا نے، حتیٰ کہ امام ابوحنیفہ کے صاحبین (امام محمد اور امام ابویوسف) نے بھی بعض جزوی تفریعات میں اپنے استاد کے اس کلیے سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو امام صاحب کا اصول اپنی جگہ پر بالکل صحیح اور قابل قبول ہے اور اپنے خاص محل کے لحاظ سے اس کی ایسی تاویل کی جا سکتی ہے جس سے سارے اعتراضات رفع ہو جاتے ہیں۔ امام صاحب کا قول یہ ہے کہ قاضی کا عدالتی فیصلہ ظاہراً و باطناً نافذ ہو جاتا ہے یعنی جس چیز کو وہ حرام اور ناجائز قرار دیدے وہ حرام قرار پاتی ہے .... اور جس چیز کو وہ حلال اور جائز قرار دے دے وہ حلال قرار پاتی ہے، خواہ جھوٹی شہادت کی بنا پر یہ فیصلہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ اس قول کا حقیقی مدعا سمجھنے کے لیے سب سے پہلے تو اس بات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے کہ

فقہائے حنفیہ کی بالاتفاق تصریحات کے مطابق یہاں ہر نوع کے مقدمے کا فیصلہ مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یا تو نکاح و طلاق کے مقدمات ہیں یا پھر خرید و فروخت کے فسخ و انعقاد یا ملکیت سے متعلق ایسے نزاعات ہیں جن میں اثباتِ ملک کا انحصار کسی متعین سبب مثلاً بیع و شراء یا حق وراثت وغیرہ پر ہو۔ دوسری قابل غور اور قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ ظاہراً و باطناً کے الفاظ کا ٹھیک مفہوم اور منشا متعین کیا جائے، کیونکہ اس کے صحیح تعین کے بغیر اصل قول کی صحیح جہت کے سمجھنے میں دشواری پیدا ہوتی ہے۔

عدالتی فیصلے کے ظاہراً نافذ ہونے کا مطلب تو بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ قانون کی وساطت سے اس کی تنفیذ ہو جائے گی، فریقین کے حق میں وہ واجب التعمیل اور عامۃ الناس کے نزدیک وہ قابلِ تسلیم ہوگا لیکن فیصلے کے باطنی نفاذ کا مسئلہ ذرا غور طلب اور محتاج تفصیل ہے۔ بالخصوص اُس حالت میں جبکہ عدالت کا فیصلہ غلط یا ناقص شہادت کی بنا پر باعتبارِ حقیقت صحیح صادر نہ ہُوا ہو۔ امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد یہ ہے کہ اس واقعاتی سُقم کے باوجود قاضی کا فیصلہ ظاہراً و باطناً نافذ ہو جائے گا۔ باطناً نافذ ہونے کا مفہوم بعض لوگوں نے یہ لیا ہے کہ یہ فیصلہ گویا عنداللہ بھی اس طرح نافذ ہو گیا کہ اس غلط فیصلے کی آڑ میں اگر کسی نے اپنے لیے حلال کو حرام یا حرام کو حلال کر دیا تب بھی اس نے کوئی گناہ کیا اور نہ ہی آخرت میں اس پر کوئی مواخذہ ہوگا۔ لیکن یہ مفہوم خواہ امام صاحب کے معترضین نے اُن کے قول کو پہنایا ہو خواہ بالفرض اُن کے موافقین نے ایسا کیا ہو، میرے ناقص علم اور گمان کے مطابق یہ تشریح نہ تو خود امام صاحب سے کہیں منقول ہے، نہ یہ صحیح اور قرینِ انصاف ہے اور نہ ہی امام صاحب کے اصل قول سے یہ لازم آتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اپنے قول کی اس تاویل سے قطعاً بری الذمہ ہیں۔ اتنے بڑے اور جلیل القدر دینی پیشوا اور مقتدا کے بارے میں یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ججوں کو حلت و حرمت کے خدائی اختیارات ان معنوں میں تفویض کر دیے ہوں گے اور عوام کے اندر سے احساسِ گناہ اور حلال و حرام کی تمیز کو مٹانے کا یہ راستہ کھول دیا ہوگا۔

اگر حقیقتِ حال یہ نہیں ہے اور قطعاً نہیں ہے، تو پھر بجا طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قول کا صحیح منشا کیا ہے۔ میری دانست میں اس کا صحیح منشا اور مدعا جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ دیانۃً اور اُخروی نتائج و عواقب سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر عدالتی فیصلہ جات کے محض دنیوی اثرات اور قانونی نتائج پر

غور کیا جائے، تب بھی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان فیصلوں کے بعض پہلو صرف ہماری خارجی اور مادی دنیا پر اثر انداز ہوتے ہیں اور بعض پہلو ایسے ہوتے ہیں جو ہماری داخلی زندگی کے نہایت نازک احساسات اور ہمارے خالص شخصی جذبات و تصورات کو مس کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو محض دنیوی نظم اور قانونی اعتبار سے بھی عدالتی فیصلوں کا ایک پہلو ظاہری ہوتا ہے اور ایک پہلو باطنی۔ میرے نزدیک امام ابوحنیفہ کی قائم کردہ ظاہر و باطن کی تقسیم بھی اسی قبیل اور اسی لحاظ سے ہے۔

میں ظاہر و باطن کی اس توجیہ و تعریف کو ایک مثال سے واضح کروں گا۔ فرض کیجیے کہ زید اور ہندہ کے مابین نکاح کے وجود و عدم کا معاملہ متنازعہ فیہ ہے۔ مان لیجیے کہ حقیقۃً اور فی الاصل تو نکاح موجود ہے لیکن ہندہ اس سے انکاری ہے یا طلاقِ مغلظہ ہو جانے کی مدعی ہے اور اپنے حق میں جھوٹے گواہ پیش کر دیتی ہے۔ دوسری طرف سے زید کوئی شہادت ثبوتِ نکاح کے لیے نہیں پیش کر سکتا۔ عدالت عدمِ نکاح یا وقوعِ طلاق کا فیصلہ صادر کر دیتی ہے۔ اب اس فیصلے کا ایک پہلو تو ظاہری ہے جو عالمِ مادیات سے تعلق رکھتا ہے، اور وہ یہ کہ مثلاً اب زید کے ذمے نہ ہندہ کا نان و نفقہ ہے، نہ اس کی سکونت ہے اور نہ ہی وہ ان چیزوں کے مطالبے کا حق رکھتی ہے۔ لیکن اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو عالمِ معنویات سے متعلق ہے اور جسے امام صاحب کی تعبیر کے لحاظ سے باطنی پہلو بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ پہلو عصمت کی حلّت و حرمت، نکاح اور تعلقِ زناشوئی سے وابستہ ہے۔ ہندہ نے اثباتِ دعویٰ کے لیے شہادتِ زور کا جس طرح استعمال کیا ہے اس کے گناہِ کبیرہ ہونے اور آخرت میں اس کے مستوجبِ عذاب ہونے کے بارے میں تو قطعاً دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے امام ابن الھمام فتح القدیر میں صاف فرماتے ہیں: علی المتعدی بالدعوی الباطلہ واثباتہا بالطریق الباطل اثم یالہ من اثم (جو شخص ایک باطل دعویٰ لے کر اٹھتا ہے اور باطل طریق پر اس کے حق میں ثبوت فراہم کرتا ہے، وہ ایسے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے جس سے بڑھ کر کوئی گناہ ہو نہیں سکتا)۔ لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، اخروی نتائج کے علاوہ یہاں دنیوی اعتبارات کے لحاظ سے بھی حلّت و حرمت کے متعدد سوالات ایسے پیدا ہوتے ہیں، جن کا حل کرنا بہر حال ناگزیر ہے۔

مثلاً یہ کہ زید اور ہندہ کے مابین عدمِ نکاح کے عدالتی اعلان کے بعد (خواہ یہ اعلان واقعاتی لحاظ سے غلط ہی کیوں نہ ہو) آیا زید ہندہ سے تعلق زناشوئی قائم رکھ سکتا ہے یا نہیں، اگر رکھے تو آیا عدالت اُسے زانی قرار دے کر اُس پر حد جاری کر سکتی ہے یا نہیں، اگر زید ہندہ کی بہن سے شادی کرے تو وہ جمع بین الاختین کا مرتکب ہوگا یا نہیں، آیا ہندہ کسی دوسرے شخص سے اور کوئی دوسرا شخص ہندہ سے قانوناً اور شرعاً مناکحت اور مجامعت کا مجاز ہے یا نہیں، اگر ہے تو کیوں اور اگر نہیں تو کیوں نہیں، نیز یہ کہ آیا دوسرے شخص سے نکاح کے جواز وعدم کا کوئی اثر اُس سابق نکاح پر پڑ سکتا ہے یا نہیں؟

زید اور ہندہ کے مابین فسخ نکاح کا عدالتی فیصلہ واقعاتی اعتبار سے غلط ہی سہی، لیکن چونکہ وہ عدالتی فیصلہ ہے، اس لیے اس کا نفاذ کم از کم ظاہری حیثیت میں تو ناگزیر ہے۔ اب اگر فریقین یا عوام الناس میں سے کوئی فرد سرے سے اس فیصلے کی قانونی اور سیاسی تنفیذ ہی کو چیلنج کر دیگا تو نظامِ عدالت بلکہ پورے نظامِ حکومت میں خلفشار برپا ہو جائے گا اور بدنظمی کی ایک ایسی صورت رونما ہو جائے گی جس میں کسی بھی فیصلے، حکم یا قانون کا چلنا محال ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی شخص عدالتی فیصلے کے ظاہری نفاذ کو تو تسلیم کرے لیکن اس کے باطنی نفاذ کو تسلیم نہ کرے، بلکہ یہی کہتا رہے یا سمجھتا رہے کہ نکاح کے بطلان کا فیصلہ کالعدم اور باعتبار حقیقت بے اثر ہے تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ان سوالات کا کیا اطمینان بخش جواب دیگا جن میں سے چند ایک کا ذکر میں نے اوپر کر دیا ہے اور میں نہیں جانتا کہ اگر وہ شخص خود زید یا ہندہ کے زوج ثانی کی پوزیشن میں ہو تو وہ کونسا ایسا طرزِ عمل اختیار کر سکے گا، جس میں چند در چند اشکالات نہ پیدا ہوں۔

میرے نزدیک ان تمام الجھنوں کا قطعی حل اور نزاعات کے خاتمے کی آخری شکل یہی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے قول پر عمل کیا جائے اور عدالت کے فیصلے کو ظاہراً و باطناً نافذ خیال کیا جائے۔ اس کے بعد ہم پورے شرح صدر کے ساتھ یہ کہہ سکیں گے کہ ہندہ کا تعلق زوجیت اب بہر حال زید سے منقطع ہے اور دوسرے شخص کے ساتھ اس کا نکاح بہر حال جائز ہے۔ ہندہ نے اگر گناہ کیا ہے تو اس کا خمیازہ وہ عنداللہ عاقبت میں بھگتے گی۔ امام صاحب کے قول سے اُس کے گناہ میں یا اس کی اُخروی

سزا میں کوئی تخفیف ثابت نہیں ہوتی۔

امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی جو تاویل و توجیہ میں نے کی ہے، اس کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ مسلک بہت محکم اور معقول ہے۔ اس میں بڑی حکمتیں اور مصالح مضمر ہیں۔ اس سے احکام و قوانین شرعیہ کے عملی انطباق میں بہت سی پیچیدگیاں رفع ہو جاتی ہیں اور کتاب و سنت کی کسی نص یا کسی اصول سے اس کا تعارض ثابت نہیں ہوتا بلکہ حضرت علیؓ کے ایک فیصلے سے تو اس مسلک کی مزید تائید ہوتی ہے۔ وہ فیصلہ یہ ہے کہ ایک عورت کے خلاف ایک مرد نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ میری بیوی ہے اور اپنے حق میں گواہ بھی پیش کر دیئے۔ حضرت علیؓ نے شہادت پر اعتماد کرتے ہوئے مرد کے دعوے کو صحیح تسلیم کیا اور اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ عورت نے عرض کیا کہ میں فی الحقیقت تو اس کی بیوی نہیں تھی، لیکن جب آپ نے فیصلہ دے ہی دیا تو اب میرا اس مرد سے نکاح بھی کرا دیجیے تاکہ میں اس پر حلال ہو جاؤں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا زوجاك شاهداك (تیرے خلاف دو شہادتوں نے تو اب تیرا نکاح اس مرد سے گویا کر ہی دیا ہے۔ اب تزویج کی حاجت باقی نہیں رہی)۔ اس مقدمے میں حضرت علیؓ کے قول و فعل نے یہ ثابت کر دیا کہ عدالت کا فیصلہ ظاہر و باطن میں نافذ ہو جاتا ہے۔ اسی سے امام صاحب کے الفاظ ظاہراً و باطناً کے صحیح معنی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

بہر حال اس بحث سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مسلک پر عائد کردہ معارضات غلط فہمی پر مبنی ہیں، ورنہ اگر غور و تامل سے کام لیا جائے تو امام صاحب کی دقت نظر اور ان کے فہم و فراست کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

غلام علی